دوسرا باب

اردو میں غیر افسانوی نثر کا ارتقا عابد سہیل کے عہد تک

الف: اردو کی پہلی نثری تصنیف

ب: اردو غیر افسانوی نثر کا فروغ

ج: ترقی پسند عہد اور غیر افسانوی ادب

☆غیر افسانوی نثر کی تعریف

اردو نثر بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر۔داستان، ناول وافسانہ وغیرہ کی زبان کو افسانوی نثر کہا جاتا ہے جب کہ خاکے، خودنوشت وسوانح ،خطوط اور انشائیے وغیرہ غیر افسانوی نثر میں تحریر کئے جاتے ہیں۔ویکیپیڈیا میں غیر افسانوی نثر کی تعریف اس طرح لکھی ہے

> "تخلیقی ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب۔تخلیقی عمل میں دنیا کی حقیقتوں، مسائل، تجربات، مشاہدات اور احساسات کو قصہ پن کے بغیر ادب اور فن کے تقاصوں کی تکمیل کے ساتھ پیش کیا جائے تو ایسی نثر غیر افسانوی نثر کہلاتی ہے۔غیر افسانوی ادب میں قصہ بیان کرنے کی بجائے ادیب، زندگی میں درپیش حقیقی واقعات کو اپنے احساسات، اختیار کردہ مخصوص صنف کی ہیئت کے دائرہ کار میں پیش کرتا ہے۔"(۱)

پروفیسر مجید بیدار اپنے غیر افسانوی نثر کی وضاحت میں لکھتے ہیں

> "تخلیقی عمل میں دنیا کی حقیقتوں، مسائل، تجربات ، مشاہدات اور احساسات کو قصہ پن کے بغیر ادب اور فن کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ پیش کیا جائے تو ایسی نثر "غیر افسانوی نثر" کہلاتی ہے۔"(۲)

دونوں تعریفوں کو بنیاد بنا کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیر افسانوی نثر کی بنیاد حقیقت پر ہوتی ہے جس میں مشاہدات وتجربات کو سادگی اور سلاست کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور اس میں افسانوی ادب کی طرح قصہ نگاری نہیں کی جاتی۔

☆ اردو کی پہلی نثری تصنیف

تحقیق میں یہ ضروری نہیں کہ کسی محقق کے اخذ کئے ہوئے نتائج وحقائق حرف آخر ہوں، جیسے جیسے وسائل اور ذرائع فراہم ہوتے ہیں، تحقیق شدہ موضوع میں نئے حقائق رونما ہوتے جاتے ہیں۔اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ اس کے بعد گزشتہ تحقیق بے وقعت ہوجاتی ہے بلکہ اس کی اہمیت بجائے خود مسلم رہے گی کیونکہ نئ تحقیق کی منزل تک پہنچنا بغیر پرانی تحقیق کی مدد کے ممکن نہیں۔

جتنا اختلاف محققین کے درمیان اردو زبان کی پیدائش اور آغاز کولیکر ہے اتنا ہی اختلاف اردو ادب کی پہلی نثری تصنیف کے تعین میں بھی ہے۔اردو ادب کے محققین نے اس موضوع پر بڑی عرق ریزی سے کام کیا اور اپنی اپنی فکر رسائی وتحقیق کے اعتبار سے پہلی نثری تصنیف کے لئے مختلف کتابوں کے نام پیش کئے۔

اردو کی پہلی نثری کتاب کے تعلق سے سب سے پہلے آب حیات کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد کا قول ملتا ہے انھوں نے فضلی کی 'دہ مجلس' کے اول نثری نمونہ ہونے پر احتمال ظاہر کیا ہے۔فضل فضلی کی دہ مجلس کا نام دراصل کربل کتھا ہے حالانکہ فورٹ ولیم کالج میں جو مخطوطات کی فہرست مرتب کی گئی اس کے فہرست نگار ڈاکٹر اشپرنگر نے اس کتاب کو 'دہ مجلس' کے نام سے درج کیا ہے۔مولانا محمد حسین آزاد اور دوسرے کئ محققین نے بھی اسے 'دہ مجلس' سے موسوم کیا ہے۔لیکن مولوی کریم الدین جنھوں نے اس کتاب کے کئی اقتباسات نقل کئے ہیں اور ان کا 'تذکرہ' ،کربل کتھا کے متعلق اصل ماخذ رہا ہے،اس کتاب کا نام 'دہ مجلس' کے بجائے کربل کتھا بتاتے ہیں۔

محمد حسین آزاد اول نثری تصنیف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں

> ''۔۔۔اردو میں اس وقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی۔۔۔میر جعفر زٹل کے کلام کو محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانہ کا نمونہ کہتے ہیں،مگر زٹل کا اعتبار ہی کیا؟ البتہ محمد شاہ کے عہد میں 1145 ہجری میں فضل تخلص کے ایک بزرگ نے دہ مجلس لکھی۔۔۔اور غالباً یہی نثر اردو کی پہلی تصنیف ہو۔''(۳)

اس قول سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ آزاد نے یقینی طور پر فضل کی دہ مجلس کو اردو نثر کی پہلی تصنیف قرار دیا ہو کیونکہ لفظ 'غالباً' سے حتمی فیصلہ سے گریز کیا ہے اور بعد کے محققین کو دعوت تحقیق دی ہے۔اسی طرح اگر دہ مجلس کے دیباچہ پر نظر کی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ فضلی نے ہی اردو نثر میں پہلی کتاب لکھی ملاحظہ ہو۔

> ''پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کرام کوں عقل چاہئے کامل، اور مدد کسو طرف کی

ہوئے شامل، کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدیؐ یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آوے، ولہٰذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع، اور اب لگ ترجمۂ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوے مستمع، پس اس اندیشۂ عمیق میں سر بہ گریبانِ فکر ڈال دریائے اندوہ و تحیر میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل اور تدبیر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ کعبہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی گلشن افکار پر اہتزاز میں آ یہ بات آئینہ خاطر میں منہ دیکھلائی کہ یہ فکر عظیم بغیر امداد اروحِ مقدس حسنین علیہم السلام حسب الخواہش محبوں کے سر انجام نہ پاوے۔'' (۴)

اس اقتباس میں 'پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع، اور اب لگ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوئے مستمع' کے جملے سے گمان پیدا ہوتا ہے کہ اس سے قبل اردو میں کوئی بھی نثری ترجمہ باقاعدہ نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی کتاب بعبارت 'ہندی' وجود میں آئی تھی۔ لیکن اگر اس اقتباس سے کچھ اوپر کی چند سطروں کو دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ فضلی کا دعویٰ روضۃ الشہد ایعنی ذکر کربلا کو پہلی مرتبہ اردو نثر اور بعبارت ہندی میں ترجمہ کرنے پر ہے نہ کہ پوری زبان اردو میں پہلی نثری کتاب کو ترتیب دینے پر۔

فضلی نے روضۃ الشہدا کا اردو ترجمہ اس لئے کیا کہ جب عورتیں کتاب روضۃ الشہدا سے مصائب سنتی تھیں تو فارسی کے دقیق الفاظ کی وجہ سے انھیں معانی و مطالب ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتے اور وہ بعد میں افسوس کرتیں کہ ہم کم نصیب فارسی عبارت نہیں سمجھتے اور ٹھیک سے مصائب سید الشہدا پر گریہ نہیں کر پاتے۔ ملاحظہ ہو

''۔۔روضۃ الشہدا کا کہ سب نکتہ سنجان مناقب شاہ لافتی نے اور سب دقیقہ فہمان مصائبِ سید الشہدا نے واقعہ شہادت شاہ کربلا کا اوس میں لکھا ہے، سونا تہا لیکن معانی اوس کے نساء عورات کی سمجہہ میں نہ آتے تہے، اور فقرات پر سوز و گداز اوس کتاب مذکورہ کے بسبب لغات فارسی اون کوں نہ رولاتے تہے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خانی کے سب یہ مذکور کرتے کہ صد حیف و صد ہا افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بدنصیب رہتے۔'' (۵)

چونکہ عورتیں فارسی کے دقیق الفاظ سے واقف نہیں تھیں تو فضلی نے اسے پہلی مرتبہ نثری اردو زبان میں منتقل کیا اور اس سے پہلے ذکر کربلا بہ شکل نثر موجود نہ ہوا اس کا قوی احتمال اس لئے بھی ہے کہ اس زمانے میں یا اس سے

پہلے ذکرکر بلا منظوم ہوتا تھا جس کے نمونہ اشرف بیابانی کی 'نوسر ہار' اور عادل شاہی وقطب شاہی دور کی مثنویوں اور مرثیوں میں ملتے ہیں۔ فضلی نے یہ جملہ ''پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع'' ذکر کر بلا کو نثر میں پہلی مرتبہ ڈھالنے کی بنا پر کہا ہوگا اور ممکن ہے اسی جملے کی وجہ سے مولانا محمد حسین آزاد نے دہ مجلس کو اردو نثر کی پہلی تصنیف کہا ہو۔ فضلی کے اس جملہ ''پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع'' کی وجہ سے صرف مولانا ہی نہیں بلکہ گل رعنا کے مصنف مولانا حکیم سید عبدالحئی نے اور سیر المصنفین کے مصنف محمد یحیٰ تنہا نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں دہ مجلس کو ہی پہلی نثری تصنیف خیال کیا ہے کتابوں کی عبارت ملاحظہ ہو

''زیادہ چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فضلی شاعر نے ۱۱۴۵ ہجری میں دہ مجلس کے نام سے ایک کتاب نثر اردو میں لکھی ہے اور اس کا بیان ہے کہ اردو نثر میں یہ پہلی کتاب ہے'' (٦)

''افسوس ہے کہ نظمِ اردو کے ساتھ ساتھ نثر اردو کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ اب ایک عرصہ کے بعد محمد شاہ کے عہد میں فضلی تخلص ایک بزرگ ۱۱۴۵ ہجری میں دہ مجلس لکھی اس کے دیباچہ میں وہ سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نثر اردو کی پہلی تصنیف ہے۔'' (٧)

کسی بھی محقق نے فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا کو حتمی اور یقینی طور پر اردو زبان کی پہلی تصنیف قرار نہیں دیا ہے اور بعد کے محققین نے اپنی جدید تحقیق سے یہ ثابت بھی کر دیا کہ دہ مجلس اردو نثر کی پہلی کتاب نہیں ہے۔

احسن مارہروی جنھوں نے اردو نثر کی تاریخ مرتب کی ہے وہ لکھتے ہیں

''وسائل تحقیقات کی قلت سمجھے یا اپنی غفلت کہ اردو نثر کا پہلا مرقع کتابی شمس العلماء محمد حسین آزاد نے فضلی کے ترجمہ دہ مجلس کو سمجھا ہے اور اب تک جس کسی نے اردو کی تاریخ لکھی ہے اسی تحقیق کو مکمل جانا ہے اس باب میں مابعد کی تمام تالیفیں تقلیدی ہیں نہ تحقیقی۔ ان مقلدین میں وہ مصنفین مستثنیٰ سمجھے جائیں جنھوں نے 1920ء کے بعد دادِ تحقیق دی ہو۔'' (٨)

احسن مارہروی کے نزدیک اردو نثر کی پہلی تصنیف دکن میں لکھی جا چکی تھی کیونکہ وہاں (دکن میں دہ مجلس سے) کئی برسوں پہلے اردو میں نظمیں کہی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عہد محمد شاہ میں اردو نثر کی پہلی

تصنیف کے وجود کو ایک وہم سے زیادہ خیال نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں

''۔۔۔جب صوبۂ دکن میں اب سے پانسو برس پہلے کا سرمایہ نظم دستیاب ہوتا ہے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بکثرت نہ سہی بقلت ہی نثر اردو کا کوئی نمونہ نہ ہو؟۔۔۔سلاطین بہمنیہ اور ان کے بعد عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کے عہدوں کی اتنی تالیفیں نظر افروز ہوئیں جن کے سامنے یہ قیاس وہم سے زیادہ وقیع نہیں رہا کہ نثر اردو کی پہلی تصنیف محمد شاہ کے عہد میں ہوئی ہے۔'' (۹)

لیکن پھر وہی سوال قائم ہوتا ہے کہ آخر اردو کی پہلی تصنیف کون سی ہے؟ کیونکہ احسن مارہروی اپنی کتاب میں فضلی کی دہ مجلس کے اول نثری نمونے ہونے کی تردید تو ضرور کرتے ہیں لیکن یہ واضح نہیں کرتے کہ وہ دکن میں کس مصنف کی کون سی تصنیف کو اردو نثر کی پہلی کتاب تصور کرتے ہیں۔ اردو نثر کے اول نمونے کا غیر متعینہ ذکر ان کی دلیلوں اور نتیجوں کو کمزور بنا دیتا ہے۔ بس ایک اقتباس سے غیر واضح اشارہ گیسو دراز اور شمس العشاق کی طرف ضرور ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

''جس طرح مصنف کی زندگی کے ساتھ تصنیف کی ترمیم واصلاح قائم رہتی ہے اسی طرح اگر ذوق تالیف کے ساتھ شوق تحقیق بھی جاری رہا تو ممکن ہے آج ہم کو آب حیات کی تلاش کے بعد فضلی سے حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز اور شمس العشاق وغیرہ ہم مدنظر آئے ہیں ہمارے بعد دوسروں کے سامنے اور نئی صورتیں رونما ہو جائیں۔'' (۱۰)

محققین کی تحقیق سے ایک بات بالکل واضح ہے کہ اردو کی جائے پیدائش اگرچہ شمالی ہند ہے لیکن اس کے خد وخال کے ابھرنے اور گیسو کے سنورنے کے لئے جنوبی ہند کی مٹی زیادہ زرخیز ثابت ہوئی۔ شمالی ہند شروع ہی سے میدان کارزار بنا رہا اور بیرونی سلاطین کے حملوں سے ہمیشہ لرزتا رہا اس افراتفریح کے ماحول میں انسان بقائے حیات کے اسباب پر توجہ دیتا ہے نہ کہ زبان و بیان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ جنوبی ہند میں شمالی ہند کے مقابلے امن تھا اور ۱۳۲۸ء میں جب سلطان تغلق نے دلی کے بجائے دولت آباد کو پائے تخت بنانے کا عزم کیا تو مشائخ واکابرین کے علاوہ تقریباً پوری دلی ہی سلطان کے ساتھ جنوبی ہند منتقل ہوگئی اور یہاں کی پر امن فضا نے شمالی ہند کی نومولود وناتواں زبانِ اردو کو ایک صحتمند جسم عطا کرنے میں مدد کی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی پہلی تصنیف 'کدم راؤ پدم راؤ' (منظوم مثنوی)، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ، اردو میں پہلا مرثیہ 'نوسر ہار' اور

اردو کی پہلی داستان 'سب رس' وغیرہ کا تعلق دکن سے ہی ہے۔ احسن مارہروی کا یہ دعویٰ کہ دہ مجلس کی تخلیق سے برسوں پہلے جب دکن میں اردو نظم کا سرمایہ موجود ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ نثری تصنیفات تخلیق نہ کی گئیں ہوں؟ اس وقت تک منزل اشتباہ سے مقام استحکام کو نہیں پہنچے گا جب تک کسی دکنی نثری تصنیف کے لئے یہ دعویٰ ثابت نہ ہو جائے کہ یہی اول نثری نمونہ ہے۔

شمالی ہند سے تعلق رکھنے والے ایک مذہبی رہنما خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی گزرے ہیں جن کا مزار کچھوچھہ شریف میں ہے۔ انھوں نے ایک رسالہ اخلاق وتصوف میں تصنیف کیا تھا جس کا سنہ تصنیف ۱۳۰۸ء یعنی ۷۰۸ ہجری بتایا جاتا ہے۔ اس رسالہ کی عبارت کا نمونہ کچھ اس طرح ہے۔

''اے طالب آسمان و زمین سب خدا میں ہے، ہوا سب میں خدا ہے، جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات ہے''(۱۱)

اس کتاب کو اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دینے والے پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب داستان تاریخ اردو میں یہ حتمی طور پر تحریر کر دیا کہ اس سے پہلے اردو نثر میں کوئی کتاب نہیں ملتی تحریر ملاحظہ ہو

''اب تک ارباب تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگری کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔''(۱۲)

حامد حسن قادری نے اس رسالہ کو پہلا نمونہ ضرور قرار دیا مگر نہ کوئی ٹھوس شواہد دیئے اور نہ ہی کوئی مضبوط دلیل قائم کی۔ انھوں نے صرف لکھنؤ کے رسالہ نگار شمارہ دسمبر ۱۹۲۵ میں شائع میر نذر علی درد کاکوری کے مضمون کا حوالہ پیش کیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (مصنفہ اردو نثر کا آغاز وارتقا ۱۹ ویں صدی کے اوائل تک) نے اپنی تحقیق کے دوران جب میر نذر علی درد سے رابطہ کیا تو انھوں نے بتایا

''جناب حامد حسن قادری نے جس رسالے کی نشان دہی کی ہے، وہ میرے پاس نہیں ہے نہ میں نے صاحب موصوف کو دیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پرچہ، یادگار

لاہور میں ''اردو اور شمالی ہند'' کے عنوان سے میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا اس میں میں نے اس کا تذکرہ کیا ہے، یہاں اورنگ آباد میں حضرت شاہ قادر اولیا کی درگا میں، محبوب علی شاہ نامی ایک خادم تھے (عرصہ ہوا ان کا انتقال ہوگیا) ان کے پاس سید اشرف جہانگیر والی کتاب کو میں نے خود دیکھا تھا۔'' (۱۳)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی تحقیق کے دوران اس رسالہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر رسائی ممکن نہ ہوسکی، اس سلسلہ میں جو نمونہ درد کاکوروی صاحب نے فراہم بھی کرایا وہ اس قدر مختصر تھا کہ رسالہ کی زبان اور موضوع کا اندازہ کیا جانا ممکن نہ ہوسکا۔ لہٰذا موصوفہ نے اس رسالہ کے بارے میں محقق مولوی عبدالحق کو خط لکھ کر استفسار کیا۔ مولوی صاحب نے جواب میں تحریر کیا

''جس رسالے کا ذکر حامد حسن قادری صاحب نے کیا ہے وہ بہت مشتبہ ہے اور وہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا'' (۱۴)

خواجہ جہانگیر سمنانی کے رسالہ کے متعلق فقط حامد حسن قادری نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ اردو کا اول نثری نمونہ ہے۔ مگر اس کے کسی نسخہ کے دستیاب نہ ہونے سے نیز دوسرے محققین کا اس رسالہ کے ثبوت میں شکوک وشبہات کے اظہار سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ اردو نثر کی پہلی تصنیف نہیں ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو اپنی تحقیق کے دوران ایک رسالہ ''جنونیہ'' دستیاب ہوا۔ یہ رسالہ بیجا پور کے سرکاری عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ کے مطابق رسالہ کے ساتھ اردو کے منظوم رسالہ 'پند نامہ' اور 'چکی نامہ' بھی منسلک ہے۔ ڈاکٹر سلطانہ کی تحقیق کے مطابق یہ رسالہ محمد دخان روزی کا ہے اس رسالہ میں کل ۹ مقولے اردو میں ہے جن کی تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔ یہ پورا رسالہ ڈاکٹر سلطانہ نے اپنی کتاب ''اردو نثر کا آغاز وارتقاء ۱۹ ویں صدی کے اوائل تک'' میں نقل کر دیا ہے اور اس پر بحث بھی کی ہے۔ وہ اس کا سنہ ۷۹۵ ہجری کے قریب کا زمانہ بتاتی ہوئی لکھتی ہیں

''ان شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جنونیہ مربوط نثر کا اولین نمونہ ہے اور ۷۹۵ ہجری کے قریبی زمانے کی تصنیف ہے۔'' (۱۵)

رسالہ ''جنونیہ'' اردو کا پہلا مربوط نثر کا اولین نمونہ تو ہوسکتا ہے کہ اس کے جملوں میں ربط پایا جارہا ہے اور جملے بامعنی ہیں۔ لیکن اس کو اردو کی اول تصنیف قرار دینا درست نہیں اگر جنونیہ کے ۹ مقولوں کو ایک ساتھ لکھا جائے

تو ۹ سطریں بھی مکمل پر نہ ہوسکیں گی۔

انور سدید نے بھی اس کتاب کو تصنیف قرار نہیں دیا بلکہ وہ تو اسے اردو کی کتاب ہی تسلیم نہیں کرتے وہ اپنی کتاب اردو کی مختصر تاریخ میں تحریر کرتے ہیں

> ''۔۔۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ رسالہ جنونیہ کی اساسی زبان فارسی ہے اور سولہ صفحات کے اس رسالے کو جس میں صرف نو مقولے اردو کے ہیں اردو کی تصنیف قرار دینا مناسب نہیں اس رسالے سے صرف اتنی سی بات ثابت ہوتی ہے کہ ۱۳۹۲ء کے لگ بھگ اردو مقولے بول چال کا حصہ بن چکے تھے۔(۱۶)

اردو کی پہلی نثری تصنیف کی فہرست میں معراج العاشقین کا نام ایک زمانے تک لکھا جاتا رہا۔ اس کتاب کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے دریافت کیا تھا اور اپنے مقدمہ کے ساتھ 1343 ہجری (1924) میں شائع کیا تھا۔ مولوی عبدالحق نے ہی اسے اردو کی نثری دنیا میں اولیت کا درجہ دیا اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کیا۔ وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں

> ''ابھی تک قدیم نثر کے جتنے رسالے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سب سے قدیم معراج العاشقین ہے۔ اگرچہ پروفیسر حامد حسن قادری اردو کا سب سے پہلا نثر نگار شمالی ہند کے ایک بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کو قرار دیتے ہیں۔۔۔نصیر الدین ہاشمی اور بعض دوسرے مورخین حضرت عین الدین گنج العلم کو اردو کا اولین نثر نگار کہتے ہیں، مگر ابھی ان کی بھی کوئی مستند تصنیف نہیں ملتی اس لئے ہمیں گیسو درازؒ ہی کو پہلا نثر نگار تسلیم کرنا چاہئے۔''(۱۷)

مولوی عبدالحق کی یہ تحقیق زیادہ ٹھوس نہیں معلوم ہوتی کیونکہ یہاں دوسرے نمونے کے عدم استحکام کے سبب معراج العاشقین کو اولین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ دیگر یہ کہ بعد کے جن محققین یا مدونین نے اس کتاب کو ترتیب دیا انھوں نے بھی مولوی عبدالحق کی قائم کردہ رائے کی واضح حمایت نہیں کی۔ گوپی چند نارنگ نے جب یہی کتاب 1957 میں ترتیب دی تو اپنے مقدمہ میں صاف لفظوں میں یہ تحریر کیا

> ''حضرت بندہ نواز کی نثری تصانیف کے جتنے بھی مخطوطے اب تک دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ان کی زندگی میں نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لئے ہم

انھیں قطعی طور پر حضرت بندہ نواز سے منسوب نہیں کر سکتے ہیں۔۔۔معراج العاشقین کو اردو کی پہلی تصنیف کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہے، وہ محض اتفاقی ہے۔"(۱۸)

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے "معراج العاشقین کا مصنف" عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں معراج العاشقین کی تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف اور سنہ تصنیف پر بھی تحقیقی گفتگو کی۔ انھوں نے بھی اس کتاب کو گیسو دراز کی تصنیف نہ قرار دیتے ہوئے مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تخلیق بتایا ہے۔ تقریباً سو صفحہ کی اس کتاب میں وہ دلیل وشواہد کی روشنی میں یہ تحریر کرتے ہیں

"پچھلے صفحات میں مختلف داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر واضح کیا گیا ہے کہ معراج العاشقین حضرت مخدوم سید محمد حسینی بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کے آغاز کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔"(۱۹)

اب تک اردو زبان میں پہلا نثری نمونہ کی حیثیت سے "معراج العاشقین" سب سے مضبوط دعویدار کتاب مانی جارہی تھی لیکن جیسے جیسے اس کتاب کے تعلق سے تحقیقی مقالے لکھے گئے اور محققین نے باریک بینی سے اس کتاب کا تجزیہ کرنا شروع کیا تو یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ نہ تو معراج العاشقین اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے بلکہ اور نہ ہی اس کے مصنف گیسو دراز ہیں۔ اب تک کی بحث سے یہ واضح نہیں ہوسکا کہ پہلا نثری پارہ کسے قرار دیا جائے۔ در حقیقت اس معاملہ میں حتمی فیصلہ فی الحال ممکن نہیں کیونکہ زمانہ قدیم کی لکھی گئی تصانیف کی خستگی اور بے ترتیبی اس کے تحریری زمانہ کے تعین اور تخلیق کار کی نشاندہی میں مشکلیں پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی مصنفین کے ایک جیسے نام ہونے کے سبب یہ وضاحت دشوار ترین ہوجاتی ہے کہ تخلیق پارہ پر لکھا نام کس کا ہے۔ ان تمام مسائل کے باوجود کسی نہ کسی نتیجہ تک پہنچنا بہرحال ضروری ہے ورنہ بحث بے معنی رہ جائے گی۔ جب شکوک وشبہات چار سو نظر آرہے ہوں اور ایقان وایمان عدم استحکام کی بنا پر کسی ایک منزل کی طرف رہنمائی نہ کر پا رہا ہو تو ایسی صورت میں عقلی وفطری تقاضہ ہے کہ ایسے نثر پارہ کا انتخاب کیا جائے جس کے دعوے میں شکوک وشبہات سب سے کم اور صحیح ہونے کے امکانات سب سے زیادہ ہوں۔ قدیم زمانے کا ایسا ہی ایک نثر پارہ "رسالہ شاہ راجو" کے نام سے سید یوسف حسینی شاہ راجو سے منسوب ہے۔ اس رسالہ کے لئے حتمی طور سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شاہ راجو کا ہے۔ تاہم بہت سی ایسی شہادتیں اور ثبوت موجود ہیں جو اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ شاہ راجو ہی اس کے مصنف ہیں۔

دور قدیم میں شاہ راجو نام کے دو بزرگ گزریں ہیں۔ ایک سید شاہ راجو قتال ہیں جو سید گیسو دراز کے والداور جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی تھے ۔اگر حداکثر پر بنا رکھی جائے تو ان کے انتقال کا سن 795 ہجری (1392) قرار پائے گا۔اسی نام کے دوسرے بزرگ گولکنڈہ حکمراں ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں گزرے ہیں۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے عبدالمجید صدیقی کی کتاب "تاریخ گولکنڈہ" کے حوالے سے انھیں خواجہ بندہ نواز کی اولاد سے بتایا ہے۔ان کا انتقال 1092 ہجری (1681) میں ہوا۔

یہ رسالہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ (دکن) میں 8 رسالوں کے ساتھ محفوظ تھا۔اس میں دو رسالوں کو بندہ نواز کی تصنیف بتایا گیا ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام رسالے اسی زمانے کے قریب لکھے گئے ہیں جب کہ رضی الدین شاہ راجو کا زمانہ اس سے کافی بعد کا ہے۔اس کے علاوہ شاہ راجو نام کے دوسرے بزرگ کی اردو یا فارسی کسی کتاب کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے اور نہ ہی ان سے منسوب کسی تحریر کا ذکر کسی تذکرے میں ہے۔جب کہ سید یوسف حسینی شاہ راجو کی ایک فارسی مثنوی "تحفۃ النصائح" کا ذکر ملتا ہے جسے انھوں نے اپنے فرزند گیسو دراز کے لئے تحریر فرمایا تھا۔نیز برآں اس کتاب کے طرز تحریر اور لسانی تشکیل پر سید یوسف حسینی شاہ راجو کے زمانے کی گہری چھاپ ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسی زمانے میں لکھی گئی جب سوال وجواب کے انداز میں مذہبی اور تصوف کے مسائل پر مختصر رسالوں کی تخلیق رواج پار ہے تھے۔ان سارے شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ سید یوسف حسینی شاہ راجو کا ہے جن کی تاریخ وفات مورخین نے 731 ہجری اور 795 ہجری تحریر کی ہے۔اگر بعد والی تاریخ کو بھی صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ کتاب 795 ہجری 1392 سے قبل کی تصنیف قرار پائے گی۔ڈاکٹر انور سدید اس رسالہ کی اولیت کے ثبوت میں چھ شہادتیں دینے کے بعد لکھتے ہیں

> "۔۔۔ان شواہد کی بنا پر "رسالہ شاہ راجو" کو اردو نثر کا قدیم نمونہ اور شاہ راجو کو پہلا نثر نگار قرار دینا مناسب ہے۔"(۲۰)

سولہ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ تصوف کے نکات پر سوال وجواب کی صورت میں موجود ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو

> "جان العزیز اول کچھ نہ تھا آسمان تھا نہ زمین نہ عرش نہ کرسی نہ چاند تارے نہ کچھ تھا اور ذات حق تعالیٰ اپنے میں آپی تھا۔اس حد تلک کے صفتوں کا بھی ظہر نہ تھا۔نہ اپنی خبر رکھتا تھا نہ غیر کی۔
>
> سوال۔کس واسطے خبر نہیں رکھتا تھا؟

جواب۔ کہ خبر رکھنا صفاتوں سون تعلق رکھتا ہے ہور اپنی ذات سون اپے ایسا
مشغول تھا جو کس صفتا نکا گنجائش نہ تھا جس وقت صفتا نکا گنجائش نہ تھا تو خبر رکھنا
بھی ممکن نہیں"

اردو نثر کا آغاز وارتقاء ۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، (۲۱)

اس بحث میں اولین نثری نمونہ کی حیثیت سے جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ان میں "رسالہ شاہ راجو" دیگر کتابوں کی بہ نسبت شکوک وشبہات سے زیادہ پاک نظر آتی ہے نیز اس رسالہ کا قدیم ہونا قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے لہٰذا موجودہ تحقیق کی بنا پر اردو زبان کے حوالے سے نثری تصنیف میں اس رسالہ کی اولیت کو تسلیم کرنا زیادہ مناسب ہے۔

☆ اردو میں غیر افسانوی نثر کا فروغ

اردو میں غیر افسانوی نثر کی تاریخ مذہبی کتب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ کتب اور رسائل عوام کو معرفت مبعود اور مسائل شریعت سمجھانے کے لئے لکھے گئے تھے لہٰذا اس زبان میں درباری شان وشوکت اور جاہ وجلوت کے بجائے عام بول چال کا رنگ ڈھنگ نظر آتا ہے جس کی مدد سے اردو زبان کی لسانی تشکیل اور ارتقائی منازل کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ مندرجہ ذیل چند صوفیائے کرام اور ان کی تخلیقات کا ذکر سنہ تصنیف سمیت کیا جارہا ہے نیز نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ نثر کے بدلتے منظرنامے کو سمجھا جاسکے۔

حضرف گیسو دراز بندہ نواز: آپ کا نام حضرت سید محمد حسینی اور لقب گیسو دراز تھا۔ دولت آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شاہ راجو کے وصال کے بعد دلی کوچ کر گئے تھے۔ آپ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی جنھیں بکثرت فضل و دانش ''گنج المعانی'' کہا جاتا تھا کے مرید تھے۔ اور اپنے مرشد کی وفات کے بعد 801 میں کئی مقامات سے ہوتے ہوئے دکن روانہ ہو گئے اور 815 ہجری میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے دور میں گلبرگہ پہنچے۔ جب آپ گلبرگہ کی سرزمین پر پہنچے تو آپ کے ساتھ اپنے مرشد کے باقی مریدان بھی جمع تھے جس کی خبر اس کے وقت کے بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کو ہوئی تو اس نے تمام امراء کے ساتھ اپنے بیٹے کو بھی آپ کے استقبال کے لئے بھیجا ۔ بادشاہ کا بھائی احمد خاں خانخاں جس نے بعد میں زمام حکومت سنبھالی آپ کے معتقدین میں تھا۔

چین وسکون میسر ہونے کی وجہ سے آپ نے دین و مذہب کہ تبلیغ میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف کیا اور بعد نماز اپنے طلبا و مریدوں کو علم تصوف اور حدیث وغیرہ کا درس دیا کرتے تھے۔ آپ کو مولوی عبدالحق نے صاحب کثیر التصانیف لکھتے ہوئے آپ کو 100 سے زیادہ کتابوں کا مصنف قرار دیا ہے جب کہ گوپی چند نانگ نے ان کے سو کتابوں کی تحریر کو محل نظر کے زمرہ میں رکھا ہے۔

جن کتابوں کو آپ سے اکثر منسوب کیا جاتا ہے ان میں مشہور معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت، دار الاسرار (اس تصنیف کو سیدہ جعفر خواجہ سے منسوب نہ کرتے ہوئے شاہ سلطان ثانی کی تخلیق بتاتی ہیں ا۔ دکنی نثر کا انتخاب، سیدہ جعفر صفحہ ۱۲۵)، رسالہ سہ بارہ کے نام ذکر ہوئے ہیں۔

معراج العاشقین کا ذکر گذر چکا ہے اس کے علاوہ ذکر شدہ تصانیف کو کسی بھی محقق نے حتمی طور خواجہ بندہ نواز سے منسوب نہ کرتے ہوئے کسی نہ کسی شبہ کا ضرور اظہار کیا ہے۔

مولوی عبدالحق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

> ۔۔۔ میرے پاس آپ کے متعدد رسالے اس زبان میں ہیں، تلاوت الوجود، درالاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ، ہشت مسائل وغیرہ اگر چہ زبان ان کی قدیم ہے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انھیں کی تصنیف ہیں یا ان سے منسوب ہیں۔ (۲۲)

نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب دکن میں اردو میں لکھتے ہیں۔

> آپ کی چند تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔۔۔ افسوس کہ ان رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم نہیں ہوا۔ (۲۳)

اور اس کے علاوہ جمیل جالبی کا وہ قول گزر چکا ہے جس میں انھوں نے سیر محمدی تصنیف میں بندہ نواز گیسودراز کی ۳۶ تصانیف کے ذکر کی بات کی لیکن دکنی اردو میں کسی ایکبھی تصنیف کا سراغ نہیں ملتا۔

بہر حال ابھی تک کی تحقیق کی روشنی میں ان تصانیف کے لئے خواجہ بندہ نواز سے قریب کوئی دوسرا مصنف محققین کی نظر میں موجود نہیں لہٰذا ان کتابوں کو آپ کی طرف ہی منسوب کر کے متعارف کرانا زیادہ بہتر ہوگا۔

> ”رسالہ سہ بارہ سوال وجواب کے طرز پر تحریر ہے جس میں تصوف کے مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ رسالہ ہاشمی صاحب کے مطابق نواب عنایت جنگ (حیدر آباد دکن) کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ لیکن رفیعہ سلطانہ نے اپنی

کتاب میں اس کے دستیاب نہ ہونے کا ذکر کیا ہے"(۲۴)

نمونہ کلام:

سوال: ذاتی ایمان کونسا اور صفاتی ایمان کون۔

جواب: اکھنڈا حال ثابتی ہے۔سو ذاتی ایمان وہ ہے ثابتی آتی اور جاتی ہے سو صفاتی ایمان۔

ایک رسالہ خلاصۃ التوحید جو تصوف کے مسائل سمجھانے کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے اس میں 'نو بطوں' سے کس طرح کائنات کا ظہور ہوا یہ بتایا گیا ہے اور 'حقیقت محمدی اور اسم اعظم کیا ہیں کا ذکر ملتا ہے۔ رفیعہ سلطانہ اپنی کتاب میں لکھتی ہیں کہ

رسالہ کے سرنامہ پر صاف طور پر یہ عبارت لکھی ہے۔

''ایں رسالہ خلاصۃ التوحید تصنیف حضرت خواجہ بندہ نواز''

نمونہ کلام:

''امین دیکھ'' بولتے ہیں جس وقت دیکھ تصرف نہیں آیا تھا۔ ادیکھ بھی بولتے ہیں۔ ہور اسیچ بولتے ہیں پیچ گنج مخفی کے دو صفتوں سون تھا۔ ''امین دیکھ'' ''امین شاہد'' دیکھ ذات شاہد صفات ''امین نور مصدر دو دونون کا،

سید محمد اکبر حسینی: خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے فرزند تھے اور دہلی میں ہی پیدا ہوئے تھے جب والد گلبرگہ تشریف لے گئے و آپ ساتھ تھے۔ والد نے آپ کو ۸۱۱ ہجری میں خلافت بھی عطا کی تھی مگر اس کے سات ماہ بعد ہی سفر آخرت اختیار کر لیا۔ عربی و فارسی میں بہت سی تصانیف ملنے کا ذکر محققین جیسے نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار، صاحب اردو نثر کا دہلوی دبستاں وغیرہ نے کیا ہے۔ لیکن اردو نثر میں ان کی صرف ایک کتاب کا تذکرہ ملتا ہے جسے 'محمد باقعی صاحب نے ایک تعارف کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔' (دکن میں اردو صفحہ ۵۷)

نمونہ کلام:

سنو اے مسلمانوں طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے۔ جیوں کا بھروسہ نہیں۔ موجب حکم حضرت علیؓ کے عمل کرو قال النبیؐ۔۔۔ یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سون آگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سون آگے۔ یعنی مرید ہو کر توبہ کرتو بہ کرنا ہور کفر و ضلالت سوں آپ کو پاک کرنا۔

عبداللہ حسینی: اسی زمانے ایک عالم و صوفی رہے ہیں لیکن محققین کے درمیان ان کی اور خواجہ بندہ نواز سے کیا

رشتہ داری تھی اس مسئلہ پر خاصہ اختلاف ہے۔ڈاکر زوراور حکیم شمس اللہ قادری نے انھیں خواجہ صاحب کا پوتا بتایا ہے اور سید محمد نے انھیں خواجہ صاحب کا نواسہ لکھا ہے۔اور سیر محمدی میں جو بندہ نواز کا شجرہ موجود ہیں اس میں عبداللہ حسینی کا نام خواجہ صاحب کی نواسی کے شوہر کی حیثیت سے درج ہے۔

> عبداللہ حسینی نے اپنے میریدان کو سمجھانے کیلئے عبدالقادر جیلانی کی تصنیف نشاط العشاق کا ترجمہ اردو میں کیا تھا جس کا ایک مخطوطہ بقول ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ 'ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھا' (صفحہ ۱۱۵)،لیکن نصیرالدین ہاشمی نے اس کے اب دستیاب نہ ہونے کا ذکر اپنی کتاب میں دکن میں اردو میں کیا ہے(صفحہ ۶۴)۔اس کتاب کی شرح بھی لکھی تھی۔

شمس العشاق شاہ میراں جی: آپ کے نام میں اختلاف ہے کچھ نے نام میان جی اور کچھ نے میران جی لکھا ہے اسی طرح آپ کے جائے ولادت میں بھی اختلاف ہے بعض محققین بیجاپور اور مولوی عبدالحق اور پروفیسر احتشام حسین مکہ مکرمہ بتاتے ہیں (اس کی تفصیل کے لئے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔) تاریخ وفات کے سلسلہ میں بھی یہ اختلاف پایا جاتا ہے ۹۰۶ ہجری کو بعض محققین نے آپ کی سنہ وفات لکھا ہے جس کو ڈاکٹر زور مستند نہیں سمجھتے وہ ۹۰۶ ہجری سنہ ولادت شمار کرتے ہیں اور ۹۷۰ ہجری کو ان کا سنہ وفات مانتے ہیں۔اس پر تفصیلی بحث ڈاکٹر رفیعہ کی کتاب میں موجود ہے۔مولوی عبدالحق خود ان کی تحریر کے حوالے سے ایک واقعہ لکھا ہے کہ آپ زیارت مبارک کے لئے مدینہ تشریف لے گئے اور بارہ سال روضہ مبارک کے نزدیک ہی گزارے۔ایک شب جمعہ کو آپ نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا کہ وہ حکم دیتے ہیں کہ ہندوستان جاؤ تو شمس العشاق نے عذر کیا کہ انھیں وہاں کی زبان نہیں آتی ہے اس پر حضورؐ نے جواب دیا کہ 'ہمہ زبان بشما معلوم خواہد شد' (تمام زبان کا علم تمہیں ہو جائے گا)۔آپ خواجہ کمال الدین بیابانی کے خلیفہ اور مرید ہیں جن کا سلسلہ خلافت خواجہ بندہ نواز سے جا کر ملتا ہے۔

آپ پہلے ایسے صوفی ہیں جن سے نثری تصانیف کو محققین نے مستند و متیقن طور پر منسوب کیا ہے۔اردو نثر میں آپ کا مقام اس لئے بھی خاصہ بلند ہے کہ آپ کے بیٹے اور پوتے (برہان الدین جانم اور امین الدین اعلیٰ) نے بھی آپ کی اطاعت و پیروی کرتے ہوئے اردو نثر کے کمزور درخت کو تناور کرنے میں کاوش جاں صرف کی ہے۔آپ کی نثر کے سلسلہ میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں

> ۔۔۔۔جو بات یقینی ہے وہ یہ کہ اسی طرز فکر کے حامل ایک صوفی سلسلے میں کئی علما

نے نظم و نثر کی متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ ہیں میران جی شمس
العشاق ان کے فرزند براہن الدین جانم اور جانم کے بیٹے امین الدین علیٰ۔ ان
بزرگوں نے دکنی نظم و نثر میں جو اہم کام کیے وہ نہ صرف اپنے فلسفیانہ خیالات کی
بنا پر بلکہ ادبی اعتبار سے بھی تاریخ ادب میں جگہ پانے کے لائق ہیں۔ (۲۵)

ان کی مشہور نثری تصانیف گل باس، جل ترنگ، سب رس، شرح مرغوب القلوب، رسالہ تصوف ہیں۔
گلباس اور جل ترنگ: ان دو رسالوں کا ذکر کرتے ہوئے حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں

"حضرت میراں جی نے نثر اردو میں کئی رسالے لکھے ہیں اور اون میں تصوف
کے اسرار و نکات بیان کئے ہیں۔ مجملہ ان کے دو رسالے ہم نے بھی دیکھے ہیں
ایک کا نام جل ترن اور دوسرے کا گل باس ہے۔" (۲۶)

یہ رسالہ نہ تو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو دستیاب ہوا اور نہ ہی اس کا ذکر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر جمیل جالبی
اور نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتب میں کیا ہے۔
سب رس: اس رسالہ کا ذکر بھی صرف ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی کے یہاں موجود ہے۔ نصیر الدین ہاشمی
لکھتے ہیں۔

آپ کی نثر کی کتاب 'سب رس' سے موسوم ہے۔ یہ وجہی (قطب شاہی شاعر)
کی داستان سب رس کی جداگانہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ کے کتب
خانہ میں موجود ہے۔ (۲۷)

اور ڈاکٹر زور اس طرح رقمطراز ہیں

سب رس یہ کتاب دکھنی نثر میں ہے۔ اروشاہ وجیہ الدین کی فارسی کتاب کا ترجمہ
ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ ۱۱۱۸ آغا حیدر صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ کل
ایکسو اٹھاسی ورق ہیں۔ ہر ورق میں ۲۶ سطر۔ زبان نہایت پاکیزہ، اور سلیس
ہے۔ چونکہ اردو کی ابتدائی نثری کتابوں میں سے ہے اس لئے یہ مخطوطہ خاص
طور پر قابل قدر ہے۔ (۲۸)

پروفیسر عبدلقادر سرفراز نے بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات مرتب کی تھی۔ اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے

مطابق اس میں تاج الحقائق کو وجہی سے منسوب کیا تھا اور جو اقتباس پیش کیا وہ اسی کتاب (سب رس جس کو ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے میراں جی کی تصنیف بتایا ہے) سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اس اختلافی مسئلہ پر ڈاکٹر رفیعہ نے سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے

> واقعہ یہ ہے کہ یہ نہ تو سب رس ہے اور نہ وجہی کی تصنیف اس طرح اسے شاہ میران جی سے بھی کوئی تعلق نہیں بلکہ میرا قیاس یہ ہے کہ یہ تاج الحقایق ہے اور شاہ وجیہہ الدین (۹۰۱-۹۸۸) اس کے مصنف ہیں۔ (۲۹)

اس کے بعد مصنفہ نے کئی دلائل سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

نمونہ کلام:

> جکوئی عاشق کون اس سات چیز تے منع کرے خدایتعالیٰ اسے دنیا میں سوں فنا کرے خوبصورت دیکھ راک سن، ریجہ خوشبوئی، خوشکر، کیف کہا۔ بے پرواچہ اور شعر پر، خدا کوں بھوت یاد کر۔ محبت سوں بدہا اپنے کام میں مشغول رہ کس سوں نکو چھکر، یہاں آرام، یاں کام، یاں حال، یاں وصال، یاں یو کھسرے، بالے جو کچھ توں دیکھے گا سو سنے گا۔ (۳۰)

شرح مرغوب القلوب: یہ تصنیف اردو کی قدیم نثر نگاری میں خاصہ اہم مقام رکھتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس میں دس ابواب کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ نے ڈاکٹر زور کی کتاب اردو شہ پارے کے حوالے سے اس کے نو ابواب بتائے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب اردو شہ پارے میں تو نو ابواب کا ذکر کیا ہے

> 'لمبی چوڑی تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو نو ابواب پر منقسم ہے۔ (۳۱)

لیکن پھر اپنی دوسری کتاب دکنی ادب کی تاریخ میں دس باب کا ہی ذکر کیا ہے۔

> ''میراں جی نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے ''شرح مرغوب القلوب'' ان کا لکھا ہوا ایک رسالہ نثر میں ہے جس میں دس باب ہیں۔'' (۳۲)

ممکن ہے پہلی کتاب (اردو شہ پارے) میں نو ابواب کا ذکر سہوا ہو گیا ہو کیونکہ شرح مرغوب القلوب میں دس ابواب ہیں جن کو ڈاکٹر رفیعہ نے اپنی کتاب اردو نثر کا آغاز و ارتقا کے صفحے ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹ پر تحریر بھی کیے

ہیں۔

اس کتاب کو حکیم شمس اللہ قادری اور سیدہ جعفر نے میراں جی خدا نما کی تخلیق بتایا ہے۔

اس کتاب کے ہر باب کو قرآنی آیت یا حدیث نبوی سے شروع کیا گیا ہے۔ کتاب میں توبہ، طریقت، شریعت، وضو، دنیا وغیرہ مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

نمونہ کلام:

> جان کہ عشق قدیم ہے دل میں جو کلیجا سب لھوسوں بھریا ہے یوں جان ہور عشق تیں ہیں۔ عشق صغیر، ہور عشق کبیر ہور عشق اوسط عشق صغیر سو بندیاں کا خدا سون محبت رکھنی کا ہور عشق کبیر سو خدا کا بندیاں پر محبت رکیا ہور منگیاں عشق اوسط میانہ دو کے میانے کا راز ہے۔ (۳۳)

میرانجی کی زبان و بیان کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں یہ اقتباس اگر چہ ان کی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں جو اس وقت کی مجموعی اردو زبان پر روشنی ڈالتی ہیں ملاحظہ ہو

> ''میرانجی کے انداز بیان میں ادبی سے زیادہ علمی سطح ملتی ہے۔ قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بات کو شعر میں بیان کرنے کی بس ایک کوشش کی جارہی ہے جو آج سرسری معلوم ہوتا ہے۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا۔ آج وہ ہمیں مشکل، نامانوس اور بے معنی نظر آتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی تحریروں پر ہنسی آتی ہے۔ اگر یہ لوگ اس دور میں اپنی صلاحیتوں کا خون اس زبان میں شامل نہ کرتے اور اس میں زبان و بیان کے نئے نئے تجربہ (اور یہ سب حقیقت میں تجربے ہیں) نہ کرتے تو سرسوتی کی طرح اس زبان کا دریا بھی راستے ہی میں خشک ہو جاتا۔ ہندی والے آج اس ادب کو اپنے رسم الخط میں منتقل کر کے اپنی تاریخ کو اردو کی بیساکھیوں پر صدیوں پیچھے تک لے جارہے ہیں۔ یہ اردو زبان کے وہ نمونے ہیں جو نویں صدی ہجری کی زبان پر نہ صرف روشنی ڈالتے ہیں بلکہ نقوش راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس سرمائے سے مختلف تہذیبی دھاروں اور اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس کس اثر نے ہماری فکر، ہمارے اظہار کو

متاثر کیا ہے اور وہ کون سے اثرات تھے جو اٹھے ، بڑھے اور غائب
ہوگئے۔(۳۴)

برہان الدین جانم: آپ اپنے والد میراں جی شمس العشاق کی طرح عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تصانیف بھی تھے۔ والد نے خلافت عطا کی تھی لہٰذا آپ نے ان کے اصل سرمائے یعنی تصوف وطریقت کے فروغ کے لئے درس وتدریس کا بھی سہارا لیا اور رسالہ وتصنیف سے بھی کام لیا۔

آپ کی سنہ ولادت اور سنہ وفات میں اختلاف ہے لیکن بعض محققین نے سنہ ولادت ۹۵۰ ہجری درج کیا ہے لیکن بعض ۹۹۰ ہجری مانتے ہیں۔مولوی عبدالحق کا ماننا ہے کہ ان کا سنہ وفات ۹۹۰ ہجری کے بعد کا ہے اور سیدہ جعفر دکنی نثر کا انتخاب میں سنہ وفات ۱۰۰۷ ہجری بتاتی ہیں۔ایک قول صاحب تذکرۂ اولیائے دکن کا ملتا ہے کہ

’آخر آپ نے پندرہ تاریخ جمادی الثانی ۹۵۰ھ نو سو پچاس ہجری میں رحلت
کی‘(۳۵)

یہ قول اس لئے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپ نے نظم منفعت الایمان کے نیچے ۹۹۰ ہجری سنہ خود درج کیا ہے لہٰذا سنہ وفات کے لئے سب سے زیادہ قرین قیاس یہی تاریخ معلوم ہوتی ہے، یہی سنہ ڈاکٹر زور کے مطابق بھی درست ہے اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بھی اسی سنہ کو صحیح قرار دیتی ہیں۔

برہان الدین جانم کی تصانیف محققین کے لئے اردو کی لسانیاتی تشکیل کی تفہیم میں کافی مددگار ثابت ہوئیں اس کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ محققین نے مستند طور پر آپ کی طرف منسوب تصانیف کو ڈھونڈ نکالا جس کی وجہ سے تحریر کا زمانۂ تخلیق اور خالق دونوں میں شک وشبہات کی گنجائش باقی نہیں رہی جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں

’’اردو نثر کی تاریخ میں برہان الدین جانم کی اہمیت ان کی اولیت ہے۔ان سے
پہلے کی کوئی نثری تصنیف ہم تک نہیں پہنچی۔‘‘(۳۶)

دوسرا سبب یہ کہ اردو نثر میں آپ کی تحریر اپنے اسلاف کی تحریر سے جدا نظر آتی ہے۔اس میں شعوری طور پر ادبی طرز کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔انداز بیان میں بھی تبدیلی ملتی ہے۔عربی و فارسی کے الفاظ سے حتی الامکان احتراز کیا گیا ہے۔مسائل کو سمجھانے کے لئے حکایت کی مدد لی گئی ہے۔تشبیہات کے ذریعہ دقیق نکات کو ذہن نشیں کرایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

محققین نے آپ کے فن اور انداز بیان اور تشکیل پاتے لسانی رجحان پر فراق دلی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

مثلاً ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

''ان کا اسلوب بیان میراں جی کی تصانیف سے زیادہ سادہ ہے۔لسانیاتی نقطہ نظر سے ان کے کارنامے محققین کے لئے کافی مواد پیش کرتے ہیں۔''(۳۷)

سیدہ جعفر برہان الدین جانم کی نثر کا جائزہ لینے اور عبارتی سقم بیان کرنے کے بعد تحریر کرتی ہیں۔

''برہان الدین جانم کی نثر میں ترسیل کی بعض کوتاہیوں کے باوجود انشا کے محاسن کی جھلک کہیں کہیں ضرور نظر آتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مصنف کے سامنے نثر کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں تھا جو اس کی رہبری کرسکتا''(۳۸)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ایک جگہ جانم کی تحریر کی خوبیوں کو اس طرح بیان کرتی ہیں

''شاہ صاحب کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظموں میں اکثر ہندی بحریں استعمال ہوئی ہیں۔اور وہ ہندوستانی اور اسلامی دونوں روایات وتلمیحات سے یکساں کام لیتے ہیں۔مثلاً یوسف زلیخا وغیرہ کے ساتھ وہ سری کرشن جی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔۔۔۔ان کی نظموں کی بحروں میں موسیقیت اور ترنم ہے تشبیہ واستعارے برجستہ ہوتے ہیں۔فلسفیانہ مضامین کو وہ ہلکی پھلکی زبان سے بڑی عمدگی سے ادا کرتے ہیں۔مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں جس شخص میں آدم کے گن نہ ہوں اس کو انسان کیسے کہہ سکتے ہیں۔صورت اعتبار کے لائق نہیں بلکہ اوصاف زیادہ اہم ہیں۔''(۳۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جانم کی دو تصانیف کلمۃ الحقایق اور وجودیہ کا جائزہ لینے کے بعد تحریر کیا ہے

''جانم ،میرانجی سے زیادہ اعتماد کے ساتھ اردو زبان میں اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر میراجی کی رویت کی تکرار ضرور کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ جانم کے ہاں میرانجی کی مخصوص فکر اور اسلوب بیان بھی آگے بڑھتے ہیں۔جانم اس متروک اسلوب وروایت کے نمائندہ ہیں جو گجری کی کوکھ سے نم لیتی ہے اور اسی لئے آج ان کے کلام میں ایک اکتا دینے والی یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔کسی زندہ زبان وادب کی روایت یونہی بنتی بگڑی ہے۔اس

کے بننے میں سینکڑوں آوازیں شامل ہوتی ہین۔ ان میں سے کچھ آنے والی نسلوں کے لئے بے معنی ہوجاتی ہیں اور کچھ زندہ روایت کا حصہ بن کران کے دلوں کے ساتھ دھڑ کنے لگتی ہیں۔ جانم کی روایت بھی انہی آوازوں میں شامل ہو کرگم ہوجاتی ہے۔''(۴۰)

تصانیف: شاہ برہان الدین جانم کی مشہورنثری تصانیف کے نام کلمۃ الحقایق، رسالہ وجودیہ، مقصودابتدائی، ذکرجلی، کلمۃ الاسرار، معرفت القلوب، ہشت مسائل اور رسالہ تصوف ہے۔ لیکن جمیل جالبی نے صرف نثری تصانیف کے علاوہ سب کومشکوک قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''کلمۃ الحقائق اور رسالہ وجودیہ ان کی نثر تصانیف ہیں۔ باقی دوسری نثری تصانیف ''مشکوک'' ہیں''(۴۱)

مقصودابتدائی: یہ رسالہ صرف کلمۃ الحقایق کے ساتھ منسلک ہے اوراس کا انداز بھی کلمۃ الحقایق کی طرح ہے اس لئے ڈاکٹر زوراسے برہان الدین جانم کی تصنیف میں شمار کرتے ہیں حالانکہ اس میں کسی مصنف کا نام نہیں درج ہے۔اس کتاب میں سوال وجواب کے پیرائے میں کائنات کی تخلیق کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

نمونہ کلام:

سوال: اول تھے اول کیا تھا

جواب: اول حق ہی چ تھا

سوال: کیوں تھا

جواب بولیا آپ سین آپ تھا

''کلمۃ الاسرار'' اس تصنیف میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ 'کلمہ' کی وضاحت وتشریح کی گئی ہے اورنحوی و صرفی وضاحت کے علاوہ عارفانہ اورتصوف وغیرہ کے حوالے سے بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں خدا کے وجود پر بھی بحث ملتی ہے اورخدا اور بندہ کے مابین رشتہ کومچھلی اور پانی کی تشبیہ کے ذریعہ حل کیا گیا ہے۔اس رسالہ کے دو نسخے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کودستیاب ہوئے ہیں۔انھوں نے اس زبان کے سلسلہ میں لکھا ہے

''اس رسالے کی دوسری بڑی خوبی ادبیت ہے۔شاہ برہان الدین جانم کے دیگر رسالوں کی بہ نسبت اس کی زبان بہت سلیس ہے۔''(۴۲)

نمونہ کلام:

''اس حکایت کوخوب دل سون سمجھ لا کی معنی دیہان میں لاہور مچھلی نمن لا کا دریا سب جا کا پای نقل اسب۔ تب سب مچھلیاں نے آپس میں پانی پیچہ اچھکر فکران کیا کہ لوکان کہتے میں مچھلیاں کا جیومول سو پانی ہے ہور ہمیں پانی کیا ہے رہکر دیکھیان نہیں پانی کو دیکھنا پانی ہوا کیا ہور ہماری کتیک داڑھے ہوکدھر ہے۔ اپس میں اپین فکران کیان ہور پانی کو بہوت ڈھوندیانولیکن پانی اونوکون نادسیا پچھی انو مین سون ایک مچھلی بولی کہ پانی ہمنا کون کہاں دس آیگا'' (۴۳)

''ذکر جلی'' اس رسالہ کو پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی فہرست مخطوطات میں شاہ برہان الدین جانم سے منسوب کیا ہے۔ رسالہ کے متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ذکر خدا اور رسولؐ کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم وتربیت کی گئی ہے۔

نمونہ کلام:

اللہ محمد کے راز رموز کیان باتاں کسی نا محرم کے انگے نا بولنا اگر بولے گا تو کافر ہووے گا نیا گا سو دیوانہ ہوئے گا کیسکون سنا کر دیوانہ نہ کرنا ہور اپی بول کر کافر نہ ہونا اول طالب سون یوں شرطکر نا بعد از اتی اسکون ارشاد بولنا۔ نظم ارشاد ہے یوذکر بھی کا اس میں یض ہے رحمت کا فاتحہ ہے اس کا ختم ہے اس ذکر کا۔'' (۴۴)

اس رسالہ میں جانم نے تشبیہات و استعارات کا بھی شعوری استعمال کیا ہے اور جسم کے حسیات کو تشبیہ دیتے ہوئے لکھا ہے

اس روحی عناصران نے جسمانی عناصران پیدا کیا ہے اس تن میں پانچ موذی ہیں۔ چیل۔ سانپ۔ نیولا۔ کتا۔ بچھو۔

نظر سون چیل

کان سون سانپ

ناک سون ہنور

زبان سون کتا

شہوت سون بچھو

ان پانچوں کو باند کر اللہ کی یاد میں اچھنا ہور اس تن میں پانچ چور ہیں ہو پانچ ساد ہیں

عقل کا چور غصہ

علم کا چور تکبر

نماز کا چور کاہلی

روزہ کا چور بھوک پیاس

ذکر کا چور طمع

یہ رسالہ اگرچہ خالصتاً تصوف اور مذہبی احکامات کے سمجھانے کے لئے تخلیق کیا گیا لیکن اس میں اردو کی لسانی شکل اور طرز ادا میں غیر معمولی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جانم کے عہد سے اردو گھٹنیوں چلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

اس رسالہ کو برہان الدین کے ایک مرید نے منظوم بھی کیا تھا۔ جس کا مخطوطہ ڈاکٹر رفیعہ کے مطابق بمبئی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

معرفت القلوب: اس رسالہ کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ دونوں محققین کے مطابق یہ رسالہ آغا حیدر حسن سابق استاد اردو نظام کالج حیدر آباد دکن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

نمونہ کلام:

جان اے سالک پہچانت رنا شریعت کا ہور حقیقت کا ہور طریقت کا، ہور معرفت

کا اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالماں کوں، ہور عاشقاں کوں
ہور واصلاں کوں، اب تو سب کوں تسلی دکھلاتا ہے، ہور دل کوں ان پر کہ راحت
پاتے ہیں۔(۴۵)

ہشت مسائل: آغا حیدر حسن کے کتب خانہ میں یہ رسالہ بھی موجود ہے جسے برہان الدین جانم سے منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ مولوی عبدالحق اس رسالہ کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ رسالہ میں ذات خداوندی اور عالم کائنات کی تشریح کی گئی ہے نیز معراج رسول صلعم کا واقعہ بھی ملتا ہے۔

نمونہ کلام: پیغمبر صاحب صلی اللہ وعلیہ وسلم کون معراج ہوا تب محمد رسول اللہ علیہ السلام نے سوال کیے سات طبق آسمان اور سات طبق زمین کیا قدیم ہے یا جدید

جواب: خدا کہا اے حبیب من ایں ہمہ جدید آفریدہ شد۔ سوال تو کچھ نہ تھا تو کیا
تھا۔ جواب: تجہ سون میں تھا

رسالہ تصوف: اس رسالہ کی نشاندہی پروفیسر عبدالقادر سروی نے فہرست مخطوطات میں کی ہے۔ رسالہ یہ عبارت تحریر ہے

'من کلام حضرت شمس المحققین شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری قدس اللہ سرہ'
(۴۶)

نمونہ کلام:

ظاہر کا تن واجب الوجود۔ اس کا دیکھ روح جاری۔ اس کا شاہد مشہود

کلمتہ الحقایق: اردو نثر میں یہ رسالہ اپنی جداگانہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ اردو کا پہلا رسالہ جو شکوک و شبہات سے پاک اپنے مصنف کے نام کے ساتھ شائع ہوا۔ رسالہ کے مرتب محمد اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں

''اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قدیم دکنی میں جتنے رسائل ملتے ہیں ہر
رسالے کے مختلف نسخوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن کلمتہ الحقایق ہی وہ
واحد رسالہ ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں کوئی اہم اختلاف جس سے اس کی
صوری ارو معنوی حیثیت بدل جاتی ہو نظر نہیں آتا۔''(۴۷)

مرتب نے مقدمہ میں (کلمتہ الحقایق صفحہ ۹) ۶ جگہ اس کے متعدد نسخہ ہونے کی نشاندہی کی ہے۔ کتاب کا سن

اشاعت متعین نہیں ہوسکا ہے لیکن ظاہری شواہد وعوامل سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ کتاب ۹۹۰ ہجری سے قبل کی ہے۔

رسالہ کا تصوف ہے جس میں شریعت کے قدیم مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے اور اپنے مریدوں اور شاگردوں سمجھانے کے لئے سوال و جواب کے پیرایہ میں آسان اور سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ دنیا کیوں تخلیق ہوئی؟ عبادت کسے کہتے ہیں؟ وہ قدیم القدیم کیوں ہے۔ فکر سے کیا مراد ہے؟ اور عناصر اربعہ (آگ، ہوا، پانی، مٹی) وغیرہ کی تخلیق کو بیان کیا ہے۔

اس رسالہ میں جانم نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے لیکن اس کی نثر میں اردو تحریر کے ادبی عکس کو دیکھا جاسکتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادبی افق پر پرواز کے لئے اردو کے بال و پر استوار ہورہے ہیں۔ مذہبی رسالہ کے باوجود عبارت میں مسجع و مقفی الفاظ و اشعار کا استعمال مستقبل میں اردو ادب کے لئے راہ استوار کررہا ہے۔ چونکہ اس کتاب کو شہرت عام حاصل تھی اور یہ کتاب اپنے عہد اور مابعد عہد ہر کس و ناکس کے مطالعہ میں تھی۔ لہٰذا اس کتاب نے لسانی طور پر اردو زبان کو خاصہ متاثر کیا ہے کیونکہ اب جو رسائل وجود میں آنے والے تھے ان کا اس لسانی تبدیلی سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس 'بدلاؤ' کے تعلق سے لکھتے ہیں

> ''کلمۃ الحقایق کے اسلوب کے سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں ہندوی و فارسی طرز احساس کی کشمکش زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ فارسی اسلوب و آہنگ غالب آنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے اور اردو نثر کا پہلا ادبی اسلوب اسی کشمکش کی کوکھ سے جنم لے رہا ہے۔۔۔ یہ رنگ بیان کلمۃ الحقایق میں عام ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا نثری اسلوب فارسی کے سہارے کھڑا ہونے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کے لہجے میں، جملے کی ساخت میں وہی انداز ہے جو فاسی نثر میں ملتا ہے۔ اسی کے زیر اثر جانم مسجع و مقفی عبارت لکھنے کی کوشش کرے ہیں لیکن جلد ہی، بیان کی کمزور روایت کی وجہ سے، یہ سرا ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے۔ جانم کے ہاں یہ شعوری عمل ہے اور جہاں انھیں اظہار میں ذرا سی آسانی میسر آتی ہے وہاں وہ اسی نوع کی عبارت کو اختیار کر لیتے ہیں''
> (۴۸)

نمونہ کلام میں مثال ملاحظہ ہو

اللہ کرے سو ہوے کہ قادر توانا توی کہ او قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرنہار۔ سہج

سہج سو تیرا ٹھار۔ وسہج ہوا بھی توج تہی بار۔ جدھاں کچھ نہ تھا تہیں دوجا شریک کوئی نہیں۔ ایسا حال سمجھنا خدا تھے خدا کوں۔ خدا کوں جس پر کرم خدا کا ہوئے۔ سبب یوں زبان گجری نام ایں کتاب کلمۃ الحقایق خلاصۂ بیان وتجلی عیاں روشن شود انشاء اللہ تعالیٰ کہ خدائے تعالیٰ قدیم القدیم کیوں تھا، ذات وصفات وکل مخلوقات ابتدا وانتہا، باقی وفانی، قدیم وجدید، باہمہ وبے ہمہ، بدیں سبب سوال و جواب روشن کر دیکھلایا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کہ خدائے تعالیٰ عالم الغیب و الشہادۃ خدائے تعالیٰ کی نظر ادراک کرنہاری ہے جملہ مخلوقات پر، وہماری نظر نہیں انپڑ نہاری ہے۔''(۴۹)

عبارت میں نہار، ٹھار، بار، تہیں، نہیں، ذات وصفاۃ وکل مخلوقات، نہاری، ہماری وغیرہ الفاظ ادبی حسن پیدا کر رہے ہیں۔ یہ صوتی آہنگ اس سے قبل کے رسالوں میں صوفیائے کرام کے ذریعہ شعوری طور پر مندرج نظر نہیں آتے۔

رسالہ وجودیہ: اس رسالہ کا ذکر فقط ڈاکٹر جمیل نے کیا ہے۔ لیکن رسالہ کی کوئی سند یا انھیں یہ کہاں سے دستیاب ہوا؟ اس سے قبل کسی محقق نے اس رسالہ کا ذکر کیا، یا کسی مخطوطات کی فہرست بندی میں یہ رسالہ برہان الدین جانم کی طرف منسوب ہے کہ نہیں ایسی کوئی بھی وضاحت ان کی کتاب میں نہیں ملتی ہے۔ صرف حاشیہ پر انھوں نے مخطوطات انجمن اردو پاکستان، کراچی درکر دیا ہے۔

اس رسالہ میں وجود کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے یہاں بھی سوال وجواب کا سہارا لیا گیا ہے۔ رسالہ میں جابجا اشعار کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ چونکہ اس رسالہ میں مسائل کو صراحتاً اور وضاحتاً بیان کیا گیا ہے لہٰذا اس کی عبارت کلمۃ الحق سے زیادہ صاف زود فہم ہے۔ رسالہ کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں

''موضوع اس کا بھی تصوف ہے جس میں ''وجود'' کے مسئلے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ''وجودیہ'' میں جابجا اشعار بھی آئے ہیں۔ اس کی نظر میں فارسی اثر وآہنگ دکنی اسلوب میں جذب ہوگیا ہے اور اس میں ایک ترتیب، ایک تسلسل بھی پیدا ہو چلا ہے۔۔۔تشریح وضاحت کی وجہ سے وجودیہ میں نسبتاً باقعدگی اور ترتیب آگئی ہے اور یہ انداز امین الدین اعلیٰ کی نثر سے قریب تر ہوگیا ہے۔''(۵۰)

نمونہ کلام:

''اے تن واجب الوجود کہے سو یعنی کرنے کرنا اس وجود پر لازم ہوا ہے، آدمی پر

جیوں بارہ برس کا ہوئے لگ فرض لازم نہیں اس معنی واجب الوجود کہے یعنی لازم
الوجود جوں چاول کا موڑ پھپھتا بھرتس سوں تعلق ہے یوں نا کے خدائے تعالیٰ کوں
واجب الوجود کہتے ہیں۔'' (۵۱)

میراں جی حسین خدانما (1004 ہجری/ 1595 عیسوی - 1074 / ہجری/ 1663 عیسوی)

کتب تواریخ میں آپ کا نام سید حسن خدانما، میراں جی کاروانی عرف میراں جی خدانما سید شاہ میراں جی خدانما ملتا ہے۔ آپ کے مرید و معتقدین آپ سے اتنا متاثر تھے کہ انھوں نے آپ کو خدنما کا لقب دیا۔ میراں آپ کا تخلص تھا۔ آپ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے اور ان سے بیعت حاصل کی تھی، قادریہ سلسلہ میں آپ نے شیخ محمود بلطف معبود راز دان سے بھی خلافت حاصل کی تھی۔ بادشاہ کو ان پر بڑا بھروسہ تھا کیونکہ وہ سلطان عبداللہ کے عہد میں شاہی ملازم رہے تھے۔ بادشاہ نے انھیں کسی کام کے لئے بیجاپور بھیجا جہاں سے آپ حیدرآباد تشریف لائے اور ترک ملازمت کر کے یہیں ہدایت کے کام میں مشغول رہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب دکن میں اردو میں تاریخ وفات 1078 ہجری لکھی ہے جب کہ جمیل جالبی اور سیدہ جعفر نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں وفات کی تاریخ 1074 ہجری درج کی ہے۔ آپ کی اردو تین اہم کتابوں چہار وجود شرح تمہیدات ہمدانی اور رسالہ قربیہ کا ذکر ملتا ہے۔

یہ تمام کتابیں مذہبی نوعیت کی تھیں مگر برہان الدین جانم اور میراں جی حسین خدانما کی تحریروں میں تشبیہیں اور استعاروں کا استعمال ہلکے پھلکے انداز میں ملنے لگا تھا۔ صوفیائے کرام نے اردو نثر نگاری کے جو نقوش ابھارے تھے اسی پر سفر کرتے ہوئے اردو کو "سب رس" کی شکل میں باقاعدہ ادبی نثر کی پہلی تصنیف میسر ہوئی۔ یہ کتاب ملا وجہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں

"صوفیاء کی تحریک نے اردو کے ابتدائی زمانے میں نئے اسالیبِ بیان کو
فروغ دیا اور مختلف مقامی بولیوں کے ادغام سے اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ
کیا۔ صوفیا چونکہ برِّ صغیر کے ہر علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اس لئے اردو زبان
کے مایۂ خمیر میں ہندوستان کے ہر خطّے کے الفاظ غیر محسوس انداز میں شامل ہوتے
چلے گئے" (۵۲)

اس عہد میں شاعری کو درباری سرپرستی کے ساتھ ساتھ عوامی مقبولیت بھی حاصل تھی اسی لئے مثنویاں، قصیدے، مرثیے وغیرہ پر زور آزمائی زیادہ کی گئی اور نثری فن اس لطف و کرم سے محروم رہا۔ اٹھارویں صدی کے آخر

میں اردو داستانوں کی چند کتابیں منظر عام پر آئیں لیکن غیر افسانوی نثر میں ابھی تک کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں ملتی جس کا ادبی عنوان سے مطالعہ کیا جا سکے۔ یہ کمی 19ویں صدی میں پوری ہوئی جب خطوط، سفر نامے، سوانح حیات اور انشائیوں وغیرہ نے اردو کے دامن کو توسیع بخشی۔ غیر افسانوی ادب کی تاریخ وارتقا کو سمجھنے میں ڈاکٹر مجید بیدار کا یہ اقتباس کافی مددگار معلوم ہوتا ہے

> "ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور جدید علوم وفنون اور نئے خیالات کے فروغ کے نتیجے میں غیر افسانوی ادب ترقی کرنے لگا۔ انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے توسط سے افسانوی ادب کو فروغ حاصل ہوا اور اردو ادب پر داستانوں کی حکمرانی رہی لیکن 1824 میں دلی کالج کے قیام کے بعد غیر افسانوی ادب کی طرف توجہ دی گئی۔ ماسٹر رام چندر اور ماسٹر پیارے لال نے پہلی مرتبہ ہر قسم کی حقیقتوں کی موضوعاتی وضاحت کی جانب توجہ دی جس کی وجہ سے مضمون نگاری کے علاوہ سفر نامہ کی روایت کا بھی آغاز ہوا چنانچہ محمد یوسف کمبل پوش نے عجائبات فرنگ لکھ کر غیر افسانوی ادب میں ایک نئی صنف کا آغاز کیا۔ مرزا غالب کے ابتدائی خطوط کی وجہ سے غیر افسانوی ادب کی نمائندگی 1857 سے قبل ممکن ہو سکی۔ (۵۳)

عجائبات فرنگ کے علاوہ جعفر تھانیسری کی خودنوشت سوانح "عجائبات فرنگ" جو" کالا پانی" کے نام سے مشہور ہے اور عبدالغفور نساخ کی "حیات نساخ" نے غیر افسانوی نثر میں ایک نئی صنف کا باب وا کیا۔ خطوط غالب کے ساتھ ساتھ رجب علی بیگ سرور اور بے خبر نے بھی اپنے خطوط کے مجموعے "انشائے سرور"، "فغان بے خبر" شائع کیئے۔

1857 کے بعد ہندوستان کا پورا نقشہ ہی بدل گیا۔ جنگ آزادی بظاہر ضرور ناکام ہوئی مگر ایک نئے جوش ولولے نے زندگی کے پیمانوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ زندگی کا ہر شعبہ نئے رنگ میں خود کو ڈھال رہا تھا، یہ کیسے ممکن تھا کہ زبان اور اظہار زبان پیچھے رہتے۔ اس ناکام جنگ آزادی کے بعد اردو زبان وادب میں ایک نمایاں انقلاب نظر آتا ہے جس میں اہم کردار سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے ادا کیا یا یوں کہاں جائے کہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر نئے سانچوں میں زبان کو ڈھالا گیا۔

سرسید احمد خاں نے زبان کی سادگی پر زور دیا۔ ارسال وابلاغ کے لئے کے لئے مضمون، انشائیے، تاریخ

اور رسالہ" تہذیب الاخلاق" کا سہارا لیا۔ ان کے رفقا نے بھی اس جانب بڑی دلچسپی سے قدم بڑھائے۔ محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد وغیرہ نے اپنے اپنے میدان میں قابل تحسین کارنامے انجام دیئے۔ محمد حسین آزاد نے 1880 میں" آب حیات" کے ذریعہ غیر افسانوی نثر میں جادوئی طرز اظہار کی گنجائش پیدا کی۔ الطاف حسین حالی نے" حیات سعدی" (1886) اور" یادگار غالب (1896)" کے توسط سے زندگی کی خاموش ہوجانے والی نبض میں دوبارہ حرکت پیدا کر دی۔ ساتھ ہی" مقدمہ شعروشاعری" (1893) کی سادہ نثر نے جہاں ادب کو پرکھنے کے لئے پیمانے متعین کئے وہیں غیر افسانوی نثر میں پوشیدہ وسعت کو بھی واضح کر دیا۔ سر سید اس تحریک کی مدد سے جدید علوم کے نفاذ کے ساتھ ساتھ زبان وادب کو بھی سنوارنا (upgration) چاہتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں

> علی گڑھ اردو کی اولین فکری تحریک تھی۔ اس تحریک سے پہلے زبان کی ظاہری ہئیتوں پر توجہ صرف ہوئی تھی۔۔۔۔ سر سید سے پہلے اردو کا بیشتر تخلیقی ادب صرف شاعری کی اصناف کا احاطہ کرتا تھا علی گڑھ تحریک نے نثر کی اصناف کو بھی فروغ دیا۔ سر سید نے چونکہ افکار اور نظریات کے مغربی خزینوں کو بھی کھنگالا تھا اس لئے اس تحریک نے مشرق اور مغرب کے فکری انضمام سے اردو ادب کو مغرب کا ہم پلہ بنانے کی سعی کی۔۔۔۔ واضح رہے کہ اس تحریک نے روح اور وجدان کی نئی منازل کو سر کرنے کے بجائے موجود حقیقی رنگوں میں پیش کرنے اور قاری کے ذہن میں معنی کی بے رنگ صداقت اتارنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس تحریک نے کلاسیکی انداز عمل بھی پوری طرح اختیار نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سید کو جس قوم سے واسطہ تھا وہ شدت سے ماضی پسند تھی۔ سر سید ایک نظر مستقبل کی طرف دیکھتے تو دوسری نظر ماضی پر بھی ڈال لیتے۔ یوں انھوں نو جوان مستقبل اور بوڑھے ماضی کو بیک وقت ہم قدم رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک نہ پوری کلاسیکی تھی اور نہ رومانی۔ بلکہ اسے نو کلاسیکی نو رومانی عناصر کی امتزاجی تحریک قرار دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ (۵۴)

الغرض علی گڑھ تحریک کے زیر اثر نثری ادب میں وسعت پیدا ہوئی۔ زبان وادب کا دامن نئی اصناف سے گلزار ہوا، ترسیل وابلاغ کے جدید پیمانے وضع کئے گئے، ادب کو پرکھنے کے اصول وضوابط طے کئے گئے، عوامی مذاق اور تقاضائے زمانہ کے مدنظر ادب تخلیق کیا گیا اور ان سب کے اظہار کے لئے زیادہ تر غیر افسانوی نثر کو وسیلہ

قرار دیا گیا۔یہی سبب ہے کہ اس تحریک کے بعد ادب کے منظر نامے پر سوانح حیات، خودنوشت، سفر نامے، مضامین، انشائیے وغیرہ کی حکمرانی ماضی سے زیادہ قوی تر نظر آتی ہے۔

☆ترقی پسند عہد اور غیر افسانوی ادب

علی گڑھ تحریک کے بعد اردو ادب کی سمت ورفتار طے ہونے لگی تھی۔ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ادب، مقصدِ حیات کو سمجھنے اور سنوارنے کے لئے تخلیق کیا جا رہا تھا۔مگر نصف صدی کے بعد اس تحریک میں جمود آ گیا تھا۔ زندگی بدل رہی تھی اور ظاہر ہے اب اس کو جانچنے، پرکھنے اور سمجھانے والے پیمانے بھی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ بدلاؤ کے ان تقاضوں کو 1936 میں ترقی پسند تحریک نے پورا کیا۔انور سدید اس تعلق سے لکھتے ہیں

> ترقی پسند تحریک اردو ادب کی اولین تحریک تھی جس کے لئے باضابطہ منشور تحریر کیا گیا۔علی گڑھ تحریک ایک فعال تحریک تھی اور اس نے ادب کو شدت سے متاثر کیا۔تاہم اس تحریک نے جماعتی انداز میں ادب کی تخلیق کے بارے میں کوئی فیصلہ نافذ نہیں کیا۔(۵۵)

اس تحریک کا پہلا اعلان نامہ لندن کے نانکنگ ریستوران میں تیار ہوا جسے آخری شکل دینے میں سجاد ظہیر سمیت ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی پرشاد، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر تاثیر نے حصہ لیا۔اس اعلان نامہ میں حقیقت پسندی اور سماجی مسائل کو ادب میں جگہ دینے پر زور دیا گیا تھا۔اس تحریک کی عمارت جن بنیادوں پر استوار کی جا رہی تھی ان کی ابتدا احمد علی کے افسانوں اور اختر حسین رائے پوری کے مضمون "ادب اور زندگی" میں ہو چکی تھی۔لہٰذا جب یہ منشور ہندوستان پہنچا تو اس کی پذیرائی میں وقت نہیں لگا اور منشی پریم چند، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، نیاز فتحپوری، علی عباس حسینی، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری جیسے ادبا و دانشوران اس سے وابستہ ہو گئے۔اس تحریک نے شاعری میں نظم اور نثر میں افسانہ پر زیادہ زور دیا تاہم غیر افسانوی ادب کے سرمایہ میں بھی قابل ذکر اضافہ کیا۔"رپورتاژ" صنف کا وجود اسی تحریک کا مرہون منت ہے۔"رپورتاژ" میں کسی پروگرام کی روداد بیان کی جاتی ہے مگر یہ رپورٹ اخباری زبان میں نہیں ہوتی بلکہ اس میں ادبی پیرائے کے ساتھ تمام جزیات کو بیان کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری پروگرام کی غرض و غایت کے ساتھ ساتھ اس کے پورے حالات سے واقف ہو جائے۔ رپورتاژ سے متعلق ارشاد احمد خاں لکھتے ہیں

> "رپورتاژ کی پہچان اس کی اپنی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ

ہے۔اس صنف میں کوئی گزرا ہوا واقعہ اظہار کی تہوں تک پہنچتا اور تخلیق کار کے
اندر چھپے ہوئے رومانوی احساس کو جگاتا ہے اور پھر مصورانہ چابکدستی کے ساتھ
ایسی تخلیق کو اجاگر کرتا ہے جو واقعات کی لپیٹ میں مرقع کاری کا درجہ رکھتی ہے۔
رپورتاژ کو ایک غیر افسانوی صنف کا درجہ حاصل ہے جس میں افسانویت اور
کہانی پن کا وجود نہیں ہوتا۔ بلکہ گذرے ہوئے واقعات کی دلچسپ انداز میں
تصویر کشی ہوتی ہے۔" (۵٦)

اردو میں سجاد ظہیر نے "یادیں" کرشن چندر نے "پودے"، قرۃ العین حیدر نے "لندن لیٹر"، عصمت چغتائی نے "بمبئی سے بھوپال" وغیرہ لکھ کر رپورتاژ کی روایت کو مستحکم کیا جس کے بعد فکر تونسوی، خدیجہ مستور وغیرہ نے اس صنف میں نئے لکھنے والوں کے لئے مزید نقوش ابھارے۔

خاکوں کی ابتدا ترقی پسند تحریک سے قبل ہو چکی تھی۔ 1927 میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" اپنی مقبولیت قائم کر چکا تھا۔ اسی مقبولیت کے سبب ان سے وحید الدین سلیم نے اپنا خاکہ لکھنے کی گذارش کی جس کو انھوں نے "ایک وصیت کی تکمیل" لکھ کر پورا کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ افراد نے اس فن کو مزید نکھارا ہے۔ ان میں مولوی عبدالحق، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، علی جواد زیدی وغیرہ کے خاکے نہایت اہم ہیں۔ اپنے بھائی پر لکھا عصمت کا شاہکار خاکہ "دوزخی" کو اردو کے اہم ترین خاکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ دور وہ تھا جس میں ہر لکھنے والے کے اندر ایک جوش تھا۔ وہ قلم کے ذریعہ سماج کے چھوٹے سے چھوٹے مسائل اپنے انداز میں قرطاس پر اجاگر کر دینا چاہتا تھا۔ لکھنے والوں کی کہکشاں تھی جس میں غیر افسانوی ادب بھی تخلیق پا رہا تھا اور افسانوی ادب بھی۔ عابد سہیل کو قلم و دوات بھی اسی زمانے میں میسر ہوا تھا۔ لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے تھا مگر ایک تحریک سے وابستگی نے ان کے قلم میں فراوانی پیدا کر دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں کی جڑیں اسی تحریک سے میں پیوست ہوتی نظر آتی ہیں۔ اسی لئے عابد سہیل کے خاکوں میں جن افراد کا ذکر ہے ان میں سے اکثر ترقی پسند تھے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ دیگر افراد کے تعلق سے قلم نہیں اٹھاتے بلکہ جہاں شدت پسند ترقی پسندوں کی تصویر کشی میں انھوں نے صداقت کا رنگ گھولا ہے وہیں تحریک سے اختلاف رکھنے والے حیات اللہ انصاری کی شخصیت کو بھی جلوہ گر کیا ہے۔ انھوں نے کی تحریروں میں خاکوں کے علاوہ خودنوشت، تراجم، اداریے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ آئندہ ابواب میں عابد سہیل کی جملہ غیر افسانوی تحریروں کا جائزہ لیا جائے گا۔

حواشی

(۱)https://ur.wikipedia.org/wiki/

(۲)اردو میں غیر افسانوی ادب ایک جائزہ، مجید بیدار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد، دسمبر 2020 صفحہ 13،)

(۳) آب حیات، ص ۲۲، محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۲۰۰۳ چھٹا ایڈیشن۔)

(۴) کربل کتھا، فضل علی فضلی، ص ۲۸، مرتب خواجہ احمد فاروق، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۶۱ء)

(۵) کربل کتھا، فضل علی فضلی، ص ۲۸، مرتب خواجہ احمد فاروق، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۶۱ء)

(۶) گل رعنا، ص ۳۴-۳۵، مولانا حکیم سید عبدالحیٔ، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۷۰ ہجری طبع چہارم)

(۷) سیر المصنفین جلد اول، ص ۴۳-۴۴ محمد یحیٰ تنہا محبوب المطابع دہلی ۱۹۲۴ء)

(۸) (تاریخ نثر اردو بنام تاریخی نمونۂ منثورات، احسن مارہروی، حصہ اول، ص ۲۱ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۰ء)

(۹) تاریخ نثر اردو بنام تاریخی نمونۂ منثورات، احسن مارہروی، حصہ اول، ص ۲۱ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۰ء)

(۱۰) تاریخ نثر اردو بنام تاریخی نمونۂ منثورات، احسن مارہروی، حصہ اول، ص ۲۳ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۰ء)

(۱۱) بحوالہ داستان تاریخ اردو، ص ۱۷، حامد حسن قادری، عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء ایڈیشن دوسرا)

(۱۲) داستان تاریخ اردو، ص ۱۸، حامد حسن قادری، عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء ایڈیشن دوسرا)

(۱۳) اردو نثر کا آغاز وارتقاء ۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ص ۵۷، مجلس تحقیقات اردو حیدر آباد مطبوعہ سیاست پریس نظام شاہی روڈ حیدر آباد (اے پی)

(۱۴) اردو نثر کا آغاز وارتقاء ۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ص ۵۷، مجلس تحقیقات اردو حیدر آباد مطبوعہ سیاست پریس نظام شاہی روڈ حیدر آباد (اے پی)

(۱۵) ایضاً، ص ۵۵،

(۱۶) اردو کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ص ۱۲۰، نائیس پرنٹنگ پریس، صاحب آباد دہلی ۲۰۱۴ء)

(۱۷) معراج العاشقین، مرتب خلیق انجم، صفحہ ۵۰-۴۹، مکتبہ شاہراردو بازار

(۱۸) معراج العاشقین، مرتب گوپی چند نارنگ، صفحہ ۱۲-۱۱ آزاد کتاب گھر، کلاں محل دلی، ۱۹۵۷

(۱۹) معراج العاشقین کا مصنف، ڈاکٹر حفیظ قتیل، صفحہ ۹۰، انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش، ۱۹۸۰

(۲۰) ایضاً صفحہ ۱۲۲

(۲۱) مجلس تحقیقات اردو حیدر آباد مطبوعہ سیاست پریس نظام شاہی روڈ حیدر آباد (اے پی) ص ۲۶۱

(۲۲) (اردو کی ابتدائی نشوونما میں میں صوفیائے کرام کا کام، ڈاکٹر مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو پاکستان، طابع انجمن پریس، نشتر روڈ کراچی، اشاعت پنجم ۱۹۸۶ صفحہ ۲۳-۲۴)

(۲۳) (دکن میں اردو، نصیرالدین ہاشمی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، سنہ اشاعت جنوری مارچ ۱۹۸۵ صفحہ ۵۱)

(۲۴)(اردونثر کا آغاز وارتقاء۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،ص۸۹)۔

(۲۵)اردوادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹،صفحہ ۷۵

(۲۶) تاریخ زبان اردوار دوئے قدیم، حکیم سید شمس اللہ قادری، مطبع تاج پریس اشاعت اول،صفحہ ۱۰۸

(۲۷)دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، سنہ اشاعت جنوری مارچ ۱۹۸۵،صفحہ ۱۷

(۲۸)اردوشہ پارے، جلداول، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ ،امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹،ص ۲۶

(۲۹)اردونثر کا آغاز وارتقاء۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،صفحہ ۱۴۷

(۳۰)اردوشہ پارے جلداول، مکتبہ ابراہیمیہ ۔امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹، مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور،صفحہ، ۳۲۱،

(۳۱)اردوشہ پارے، جلداول، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ ،امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹،صفحہ ۲۶

(۳۲)دکنی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹،صفحہ ۲۲

(۳۳)دکھنی نثر کا انتخاب، سیدہ جعفر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳،صفحہ ۱۰۰

(۳۴) تاریخ ادب اردوجلداول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷،صفحہ ۱۳۶

(۳۵) تذکرہ اولیائے دکن، حصہ اول جلد سوم از محبوب التواریخ، مولوی بوتراب محمد عبدالجبار، مطبع رحمانی حیدرآباد دکن،صفحہ ۲۰۶

(۳۶) تاریخ ادب اردوجلداول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷،صفحہ ۱۶۲

(۳۷)اردوشہ پارے، جلداول، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ ،امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹،صفحہ ۳۳

(۳۸)دکھنی نثر کا انتخاب، سیدہ جعفر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳،صفحہ ۹

(۳۹)اردونثر کا آغاز وارتقاء۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،صفحہ ۱۷۹،۱۷۸

(۴۰) تاریخ ادب اردوجلداول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷،صفحہ ۱۶۴

(۴۱) تاریخ ادب اردوجلداول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷،صفحہ ۱۶۲

(۴۲)اردونثر کا آغاز وارتقاء۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،صفحہ ۱۷۰

(۴۳)اردونثر کا آغاز وارتقاء۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،صفحہ ۱۷۱

(۴۴)اردونثر کا آغاز وارتقاء۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،ص ۱۷۳

(۴۵)دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، سنہ اشاعت جنوری مارچ ۱۹۸۵،ص ۲۵۶

(۴۶)اردونثر کا آغاز وارتقاء۱۹ویں صدی کے اوائل تک، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،ص ۱۷۷

(۴۷)کلمۃ الحقایق، مرتب محمد اکبرالدین صدیقی، ناشر ادارۂ ادبیات اردوخیریت آباد حیدرآباد دکن جولائی ۱۹۶۱،ص ۱۲

(۴۸) تاریخ ادب اردوجلداول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷،صفحہ ۱۶۳

(۴۹)کلمۃ الحقایق، مرتب محمد اکبرالدین صدیقی، ناشر ادارۂ ادبیات اردوخیریت آباد حیدرآباد دکن جولائی ۱۹۶۱،صفحہ ۲۲

(۵۰) تاریخ ادب اردوجلداول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷،صفحہ ۱۶۴-۱۶۳

(۵۱) تاریخ ادب اردوجلداول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۷،صفحہ ۱۶۳

(۵۲)(اردوادب کی تحریکیں ابتدا تا ۱۹۷۵ء، ڈاکٹر انور سدید، کتابی دنیا دہلی 2008،صفحہ 160)

(۵۳)اردو میں غیر افسانوی ادب ایک جائزہ،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی صفحہ 8

(۵۴)اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا ۱۹۷۵،ڈاکٹر انور سدید، کتابی دنی دہلی2008،صفحہ 49-348

(۵۵)ایضاً صفحہ 471

(۵۶)اردو میں رپورتاژ نگاری کا فنی جائزہ، ماہنامہ فکر وتحقیق دہلی، جولائی2015